ڈاکٹر سلیم اختر

تعلیم و تعلم ـــــ کدھر؟

تعلیم کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر علم کس نوع کے افکار سے تشکیل پاتا ہے اور پھر کیا ہر نوع کے افکار اور ان کی تحصیل دائرہ علم میں آ جاتی ہے یا بعض ''مضر'' افکار سے پرہیز اور بعض معلومات کے حصول سے اجتناب بھی علم ہے؟ یہ اور ایسے ہی دیگر سوالات اساس اہمیت کے ساتھ نزاعی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور پھر جب تخلیق سے وابستہ مسائل اور عصری حالات کے تناظر میں ان ادوار کا جائزہ لیں تو ان کی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج 'ملا VS عقل' قدیم اور جدید کی کش مکش اتنی شدید اور نئی اور پرانی نسل میں خلیج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ بظاہر دونوں کناروں کے ملنے کا امکان نظر نہیں آتا۔ جدید، قدیم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں تو قدیم جدید سے خوف زدہ۔

جس طرح ذہن کی نامیاتی وحدت کی حیثیت سے کارکردگی انسانی صحت کے لیے لازم ہے اور ذہن کے دولخت ہونے سے انسان پاگل خانے کی زینت بن جاتا ہے۔ اسی طرح قوم کا بھی یہی معاملہ ہے، جب تفاوتِ نسل اس حد تک بڑھ جائے کہ خلیج نا قابلِ عبور محسوس ہو تو قوم بیمار ہو جاتی ہے جس کی اولین علامت حقائق کو حقائق کے روپ میں دیکھنے کی صلاحیت کا ختم ہو جانا ہے۔ جس طرح کوئی ایک حقیقت کو اس کے درست تناظر میں نہیں دیکھتا بلکہ حقیقت کو اپنے مریض ذہن کے کج زاویوں سے پرکھتا ہے اسی طرح قوم بھی تعصّبات کے

بھنوروں میں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہے چنانچہ حقیقت کا احساس کرانے والے ہر تلخ عنصر سے آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

قوم جب قدیم و جدید کے دوراہے پر حیران اور سرگرداں ہو تو پھر علم کی بصیرت سے ہی صحیح راہ تلاش کی جاسکتی ہے۔ ترقی پذیر ملک ہونے کے لحاظ سے ہمارا پہلا اور اولین فریضہ نئی فیکٹریاں بنا کر زرِ مبادلہ کمانا یا بچانا نہ تھا بلکہ قوم میں مقاصد جلیل کے پر جوش احساس سے مصافِ زیست میں سیرتِ فولاد کی تشکیل تھا اور بات وہی پرانی یاد آتی ہے کہ قوم سونے سے نہیں بلکہ افراد سے بنتی ہے لیکن تعمیرِ ملت کے لیے سنہری افراد کہاں سے آئیں؟ جواب ہے۔ تعلیم سے! موجودہ حالات میں تعلیم کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ نسلوں کے جس تفاوت کا آج کل بڑا چرچا ہے اور قدیم و جدید کی جس خلیج نے سب میں اعصابی تناؤ پیدا کر رکھا ہے، تعلیم اس پر پل کا کام دے سکتی ہے۔

مشرق میں روایتی تعلیم معقول و منقول کا امتزاج تھی اور ۱۸۵۷ء تک برصغیر میں بھی وہی مروج رہی۔ مذہبیات کے ساتھ ساتھ منطق و فلسفہ، گلستان و بوستان جیسی کلاسیکی کتب اور علمِ بیان و معنی، اس نصاب میں تنقید پر تقلید کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ہوسکتا ہے ان حالات میں یہ کافی ہو لیکن انگریزی حکومت میں ملک جن نئے حالات سے دوچار تھا ان میں اور بالخصوص سرکاری ملازمتوں کے حصول میں یہ تعلیم ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ اس لیے سرسید نے اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کا آغاز کیا جو اس وقت بھی اور آج بھی نزاعی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ بالائی طبقہ جو دربار سے وابستگی کی بنا پر ادب و ثقافت اور تہذیب کا مربی اور سرپرست تھا ختم ہو چکا تھا سو حالات نے اس متوسط طبقہ کی تشکیل کی اور اسے ابھرنے کا موقع دیا۔ جس کی اب تک کوئی انفرادیت نہ تھی۔ سرسید تحریک دراصل اسی ابھرتے طبقہ کی ترجمان تھی جنھوں نے انگریزی پڑھی اور سرکاری ملازمتوں کی صورت میں پہلی مرتبہ تحفظ کے

احساس سے آسودگی کی سانس لی! سرسید تحریک اور اس کی تعلیمی اصلاحات قومی سطح پر زرخیزی کی علامت قرار دی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ ان سے زندگی کے ہر شعبہ میں خیالاتِ نو کی حیات بخش رو دوڑ گئی لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جو نظامِ تعلیم درست تھا اس کا ۱۹۴۷ء کے بعد درست ہونا ضروری نہ تھا۔ جن المناک حالات میں آزادی ملی تھی ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ تمام قوم ذاتی اغراض سے ماورا ہو کر قومی افتخار کے لئے کام کرتی لیکن یہاں تو وہ لوٹ مچی کہ توبہ! قائداعظم اور قائدملت کی بے وقت موت کے بعد ملک میں ایک بھی قد آور سیاسی شخصیت نہ رہی سو اس بندر بانٹ میں تعلیم و تعلم کی اہمیت کو کون سمجھتا!

تعلیم کا مقصد اگر ذہن کو افکارِ نو کے چراغوں سے منور کرنا ہے، تعلیم کا مقصد اگر فکری آفاق میں وسعت پیدا کرنا ہے اور تعلیم کا مقصد اگر مردِ مومن پیدا کرنا ہے تو آج کے طالب علم کا وجود اس کی نفی کر رہا ہے۔ نظامِ تعلیم قومی امنگوں سے تشکیل پاتا ہے اور نصابِ تعلیم قومی سربلندی کی منزل کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ تعلیم قومی جدوجہد میں ایک ہتھیار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ قومی نقطہ نظر سے تعلیم اسی لئے بے حد اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس سے قوم میں فکری وحدت اور ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور یہ کسی بھی ملک کی بقا کے لیے لازم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ افراد خود کو کس اعلیٰ قومی مقصد سے ہم آہنگ کر کے اپنے انفرادی وجود کو پس پشت ڈال کر قطرہ کی مانند خود کو سمندر سمجھتے ہیں۔ اس جذبہ سے فقر و قناعت کے جو احساسات جنم لیتے ہیں اور ان سے جو نفسی توانائی پیدا ہوتی ہے وہ قومی تعمیر کے کام آتی ہے اور آج کے حالات میں سب سے زیادہ اس جذبہ کی ضرورت ہے۔ حکومت سے بجا طور پر ایسی تعلیمی منصوبہ بندی کی توقع کی جاسکتی ہے جس کے نتیجے میں تعلیم پر بالائی طبقہ کی اجارہ داری ختم ہو جائے، جب ہر ذہن تعلیم سے فروزاں ہوگا تو ملک سے جہالت کی تاریکی اور تعصب کا اندھیرا بھی دور ہو جائے گا لیکن یہ سب کچھ محض کاغذی منصوبوں سے نہیں ہوسکتا موسلا دھار بارش میں کاغذ کی نیا کی کیا اوقات؟

لہٰذا چند بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے جن میں سے بلحاظِ اہمیت

نصاب سرفہرست قرار پاتا ہے۔ نصاب کو ہی اگر نظامِ تعلیم میں ریڑھ کی ہڈی قرار دیا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔ ہر قوم کے چند بنیادی تقاضے ہوتے ہیں، کچھ تصورات ہوتے ہیں جن کی ضو سے قومی ترقی کی منازل جگمگاتی ہیں اور مخصوص نوعیت کے بعض آدرش ہوتے ہیں جن کے حصول کے لیے افراد کوشاں رہتے ہیں ان سب کو اگر عملی صورت دینی ہو تو اس کے لیے تعلیم سب سے موثر ذریعہ ہے اور نصاب اس کی فعال صورت ہے۔

گذشتہ نصف صدی سے ہم یہ سنتے آ رہے ہیں کہ ہمارا نصاب تعلیم لارڈ میکالے کے انہی اصولوں کی ترجمانی کرتا ہے جن کا مقصد محض حکومت کی مشینری کے لیے مفید پرزے مہیا کرنا تھا۔ اس نصاب کا حسن و قبح سب پر عیاں تھا لیکن نصاب میں اس اساسی ترمیم و تنسیخ کی کبھی بھی کوشش نہ کی گئی جس سے اس کی خامیاں دور ہوسکتیں۔ نتیجہ اس نسل کی صورت میں ظاہر ہوا جو آج انتشارِ فکر کا شکار ہے جسے قومی مقاصد اور ملی تصورات سے آشنائی نہیں جو ماضی کی ثقافتی روایات سے منقطع اور قومی مستقبل سے بیگانہ ہے۔ بیرونی جارحیت اور اس کے نقصانات تو واضح ہوتے ہیں لیکن داخلی خلفشار اور قومی انتشار دیمک بن کر قومی استحکام اور ملکی سالمیت کو اس حد تک کمزور کر دیتا ہے کہ قوم کا وجود بھی خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔

ان خطرات کا ہر وقت احساس تو ضروری ہے ہی لیکن یہ احساس انسدادی تدابیر اور چارہ سازی کے بغیر بے معنی ہے سو قومی علاج میں نصاب کی تبدیلیاں لازم ہیں۔

نصاب ایسا ہو کہ اس کے ذریعے تصورِ پاکستان، پاکستان کی تشکیل اور آزادی کی جدوجہد کی تاریخ سے ہر درجہ اور ہر سطح کے طالب علم کی روشناس لازم ٹھہرے۔ پاکستان کی تشکیل ایک مخصوص فلسفہ کی مرہون منت تھی۔ دو قومی نظریہ کیا ہے اور غیر منقسم ہندوستان کے مخصوص سیاسی اور سماجی حالات کے تناظر میں اس کی کیا اہمیت تھی ان سب امور سے طلبہ کی آگاہی بہت ضروری ہے بحیثیت پاکستانی ہماری کچھ مخصوص نوعیت کی تہذیبی اقدار اور ثقافتی معاشیر ہیں۔ یوں تو ہم لوگ مذہب کے بغیر ایک لقمہ بھی نہیں توڑتے اور اسلام کا نام سنتے ہی ہم میں ابال پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری آبادی کا کثیر حصہ اسلام، اس کے

بنیادی فلسفہ اور اسلامی طرز احساس سے نا آشنا ہے اس ضمن میں علماء راہنمائی کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے تعصّبات کی بنا پر کسی کی بھی راہنمائی کے قابل نہیں رہے ادھر تدریس کا یہ حال ہے کہ نصاب میں اسلامیات کا پرچہ رکھ دینے کے بعد یہ باور کر لیا گیا کہ تمام قوم اسلامی ہوگئی جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام نصاب اسلامی روح کی عکاسی کرتا ہو تا کہ طالب علم کے ذہن پر ہر زاویہ سے یہ روشنی منعکس ہو سکے، اور ان کے متوازی عقلی اور سائنسی علوم، فلسفہ، منطق اور دیگر مذاہب کا تقابلی مطالعہ!

انتشارِ فکر کے نقصانات قومی سطح پر ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ میری دانست میں اس کو جنم دینے میں بعض اور محرکات کے علاوہ موجودہ نصاب نے بھی خاصہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارا نصاب کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا کی مثال پیش کرتا ہے۔

کالج کے نصاب کا سرسری جائزہ لینے پر یہ تضاد واضح ہو جاتا ہے۔ کلاسیکی ادب اسلامیات، نفسیات، اقتصادیات، سیاسیات اور لسان الشرقیہ وغیرہ کا مزاج جداگانہ ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو یہ ایک دوسرے کی ضد بھی ہیں۔ ایسے نصاب سے ذہن کسی سانچہ میں نہیں ڈھل سکتا بلکہ انتشارِ فکر ہی کو جنم دے سکتا ہے۔ ان میں سے ہر مضمون کی افادیت تسلیم، ان سے آگاہی بھی لازم اور جدید انسان اور مہذب ذہن کے لیے ان سے وابستہ مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے لیکن جس انداز پر ان کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے ان کی افادیت زائل ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان مضامین کی ایسی درجہ بندی کی ضرورت ہے جس سے انتشارِ فکر کی بجائے وحدتِ فکر جنم لے سکے۔

ہم ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پائے کہ ہم دنیا کے لیے جیتے ہیں یا عاقبت کے لیے ہم نے اچھا انسان بننا ہے یا نہیں اس الجھن کا نتیجہ کردار کی ایسی دوعملی میں رونما ہوا کہ اب ریاکاری ہمارا شعار بن چکی ہے ہم مغربی ثقافت اپنانے پر مجبور ہیں۔ جب سوچ اپنی نہ رہی، طرزِ احساس اپنا نہ رہا، طرزِ فکر اپنا نہ رہا، تو قوم کیسے بنتی؟

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جاسکتا کہ جملہ قومی امراض کے لیے تعلیم اکسیر کی حیثیت رکھتی

ہے لیکن اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مرض کی علامات کی شدت میں یقیناً اس سے کمی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ہم نے ایک زندہ اور تابندہ قوم کی صورت میں اپنی انفرادیت تسلیم کرائی ہے تو اس کے لیے ہمیں جہاں اور بہت کچھ کرنا ہوگا وہاں تعلیم اور نصاب کے نظام میں بنیادی اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں سے عہدِ نو کے لیے نئی کرن مہیا کرنا ہوگی۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے قومی تعمیر اور ملی سربلندی — کشتِ ویراں کو ہنستے مسکراتے پھولوں سے معطر کرنے ہی کا نام ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہنستے مسکراتے پھول کہاں سے آئیں گے؟ اگر بیج اچھا نہ ہو، زمین زرخیز نہ ہو، پانی خراب ہو یا وافر مقدار میں نہ ملے تو کشتِ ویراں ویراں ہی رہے گی اور قوم کسی عظیم شخصیت کے ماتم میں سرنگوں پرچم کی مانند! نژادِ نو، والدین اور اساتذہ کی مثال بھی بالکل ایسی ہی ہے اگر نژادِ نو بیج ہے تو والدین کشت ہیں جن سے اس بیج کی جڑیں پھوٹتی ہیں، یوں اساتذہ حیات بخش پانی کا کردار ادا کرتے ہوئے ان ننھے منے پودوں کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ رنگ و بو کی بوقلمونی سے صفحہ ہستی کو گلزار بنا دیں۔ قومی زندگی میں بچے والدین اور اساتذہ کی ازلی تکون ملتی ہے اور یہی تکون قومی افتخار کے رفیع الشان قصر کی خشتِ اولین ثابت ہوتی ہے لیکن یہ مسئلہ تکون ایسا سیدھا سادا نہیں کیونکہ یہ ایسی تکون ہے جس کا کم از کم ایک زاویہ باقیوں سے گریز کرتے ہوئے تکون کے وجود اور بقا کو خطرہ میں ڈالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے والدین اولاد سے نالاں، اولاد والدین کو جاہل اور زمانے کی ترقی سے گریز کرنے والے سمجھتی ہے اور اساتذہ کرام بگڑتے بچے سنوارنے کے لیے ''عقل بخشوں'' اور ''مولا بخشوں'' کا سہارا لیتے ہیں۔

بچہ خراب یا بگڑا ہوا نہیں پیدا ہوتا وہ جس گھر میں آنکھیں کھولتا ہے اس ماحول کے نفسیاتی اثرات، والدین کے سماجی مرتبہ، پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے تعلقات کے انداز، بھائی بہنوں میں مناسب تعداد اور بلحاظِ پیدائش کنبہ میں درجہ بندی وغیرہ، یہ چند عوامل ہیں جن سے کسی بھی گھر کا ماحول تشکیل پاتا ہے۔ اگر ژرف نگاہی سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا

جائے تو ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ کوزے تو دھڑا دھڑ تھوک کے حساب سے بن رہے ہیں لیکن کوزہ سازی کے عمل میں کسی سلیقہ، خوش ذوقی اور فن کاری کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ مردوں کا کوئی مقصد حیات نہیں اس لیے انھوں نے افزائشِ حیات کو مقصودِ بالذات سمجھ لیا۔ عورتوں کو معاشرہ بلکہ گھر میں بھی اپنا کوئی مقصد اور مقام سمجھ میں نہیں آتا انھوں نے VEGEATIVE MOTHERLINESS کو اپنا شعار بنا لیا ہے شادی بیاہ گڑیوں کا کھیل نہیں، نہ ہی جنسی آسودگی کے لیے سماجی اور مذہبی اجازت نامہ ہے۔ ازدواجی جوڑا بچے کی پیدائش سے صرف حیاتیاتی مقاصد کی بجا آوری ہی نہیں کرتا بلکہ قومی تعمیر کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے۔ اس لیے معاشرہ اور قوم کی ترقی اور بہبود سے دلچسپی رکھنے والے مفکر شادی اور اس سے وابستہ مسائل کو بہت اہمیت دیتے رہے اس ضمن میں نطشے کے خیالات کا جائزہ بہت سود مند ثابت رہے گا۔ اس لیے کہ اس نے بھی قومی ترقی اور تشکیلِ نو کے لئے نئے اور مکمل انسان کا خواب دیکھا تھا۔ سواس کے بقول:

> ''آج کل شادی کے معنی یہ نہیں کہ سوسائٹی کی طرف سے دو افرادِ انسانی کو عیش کرنے اور خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کی اجازت دے دی جائے اور بس! آج کل کی شادی میں الفت و محبت کا نام بھی نہیں پایا جاتا۔ انسان کو اس وقت تک شادی نہیں کرنی چاہیے جب تک اس کو یقین نہ ہو جائے کہ میں تندرست ہوں، شریف النسب ہوں اور اولاد کا مستحق ہوں۔''

ایک اور موقع پر بھی اس نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا:

> ''میرے نزدیک نکاح کے معنی یہ ہیں کہ زن و شوہر اپنے سے بہتر اور قوی تر اولاد پیدا کرنے کا عزم صمیم کر لیں۔''
>
> ''یہ میرے نزدیک نام ہے دو شخصوں کے اس عزم کا کہ وہ ایک ایسے شخص کو پیدا کریں جو والدین سے بڑھ کر ہو۔''

نطشے نے ان اقوال سے دراصل قوم اور نسل کی بہتری کے لیے شادی کو اعلیٰ وارفع مقصد کے تابع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس معیار پر آج اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو اکثریت ایسے کنبوں کی نکلے گی جہاں میاں بیوی میں وہ ذہنی اور جسمانی مطابقت نہیں ملتی جو ازدواجی زندگی کو پیار اور محبت کے پھولوں سے مہکانے کا موجب بنتی ہے مردوں کی اکثریت ''مجازی خدا'' تو بن جاتی ہے لیکن ان کے لیے اچھا خاوند بننا مشکل ہوتا ہے یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بچے کی تربیت کے لیے آغوشِ مادر سے بڑھ کر اور کوئی درس گاہ نہیں لیکن اس سلسلہ میں یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ اگر ماں خاوند کے کرتوتوں (یا کسی اور وجہ سے) ذہنی اور جذباتی الجھنوں کی دلدل میں پھنسی ہو تو وہ بچوں کی کہاں تک تربیت کر سکے گی وہ جس مرد کو ناپسند کرتی ہے کیا اس کے توسط سے ملے ہوئے بچے اس کے سامنے اس کی انتہائی شکستہ اور مجروح انا کی جیتی جاگتی تصویروں کا روپ نہیں دھار لیتے؟ یہ نفسیات کا بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر میاں بیوی میں پیار نہ ہو تو گھر مریضانہ رجحانات کی آماجگاہ بن جاتا ہے نا آسودہ گھروں کے مسموم ماحول مہکتے پھولوں کے بجائے کانٹوں کی فصل تیار کرتے ہیں۔

بچہ جب مدرسہ میں آتا ہے تو یہ اس کے لیے بہت اہم اور نفسیاتی لحاظ سے دور رس نتائج کا حامل تبدیلی ثابت ہوتا ہے۔ اب تک وہ گھر کے محدود ماحول میں تھا جہاں سبھی اُس سے آشنا تھے اس لیے وہ ان میں خود کو محفوظ آزاد اور خود اعتماد سمجھتا تھا، افرادِ کنبہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اور گھر کا آنگن کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو اس میں بچے نے اپنی دلچسپی کا کوئی نہ کوئی سامان تلاش کر رکھا ہوتا ہے لیکن اس کے لیے اسکول انجان، انوکھی اور ہمجولیوں کے بیانات کے بموجب خاصی خوفناک جگہ ہوتی ہے۔ اسکول سے بچے کا تعارف کوئی خوبصورت اور قابلِ ذکر انداز میں نہیں ہوتا پرانے بچے اس مرغِ نوگرفتار کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے ہیں، بعض لیڈر قسم کے طلبہ اس پر رعب بھی جھاڑتے ہیں، ادھر استاد جب ساری جماعت کھڑی کر کے کچھ رٹوا دیتا ہے یا ڈنڈے برسا دیتا ہے تو وہ یہ سمجھ کر اپنی جگہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ تعلیمی

ترقی اور قومی سربلندی میں مجھ سے جس کردار کی توقع رکھی جاسکتی تھی وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔

پرائمری تعلیم سب سے زیادہ اہم ہے اور اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی جاتی ایسے اساتذہ جنھیں نہ بچوں سے کوئی دلچسپی ہے نہ ان کی نفسیات سے کوئی واقفیت اور نہ ہی ان کی تعلیمی ضروریات سمجھنے کا شعور، وہی اس اہم فریضے پر مامور کیے جاتے ہیں اس صورتِ حال کی کئی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ اکثر پیشوں کی مانند تدریس میں بھی لوگ ذاتی دلچسپی اور ذہنی مطابقت کی وجہ سے نہیں بلکہ فکرِ معاش کے لیے آتے ہیں جس کے نتیجہ میں عدم دلچسپی کی جھنجھلاہٹ اعصاب پر سوار رہتی ہے۔ درس و تدریس آسان اور غیر ذمہ دارانہ کام نہیں اور اگر اس کے لیے رجحان طبع نہ ہو تو بی ایڈ اور ایم ایڈ کی ڈگریاں اچھا استاد نہیں بنا سکتیں۔

بچہ اسکول میں آنے کے بعد چونکہ پہلی مرتبہ گھر کے ماحول سے نکل کر خود کو خارجی حالات کے دھارے پر چھوڑتا ہے اس لیے اساتذہ کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اس کی زندگی کے اس نئے موڑ کو زیادہ سے زیادہ پرلطف بنائیں گھر میں بگڑا بچہ خصوصاً والدین کے لاڈ پیار سے بگڑا ہوا بچہ، اسکول میں نسبتاً آسانی سے سدھر سکتا ہے۔ گھر میں وہ صرف بیٹا ہے لیکن اسکول میں وہ پہلی مرتبہ اپنی انفرادی حیثیت اختیار کرتا ہے، وہاں وہ بیٹا بھائی نہیں بلکہ اس کا اپنا ایک نام ہے اب یہ استاد کا کام ہے کہ وہ لڑکے میں اس کی انفرادیت اور ذات کا شعور پیدا کرے یہاں استاد کا طریقِ کار مثبت اور منفی دونوں صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ وہ بچے کی شخصیت کے غلط، مریضانہ اور کجرو رجحانات کی اصلاح کرتا ہے اور ساتھ ہی زندگی کی مثبت اقدار کا احساس اجاگر کرتا ہے اس کے لیے استاد اور طالب علم میں گہرے رابطے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمارے تعلیمی اداروں میں اگر کسی طرح کا رابطہ ہوتا ہے تو ٹیوشن کی صورت میں یا پھر مولا بخش کے توسط سے استاد۔ اس لیے بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ بچہ اسے اپنا آئیڈیل بنا کر خود کو اس کے ساتھ IDENTIFY بھی کر سکتا ہے لیکن استاد کی کس

خصوصیت کی بنا پر وہ اسے اپنا آئیڈیل بنائے! استاد کا تو یہ حال ہے کہ وہ بچہ کی نفسیاتی ضروریات کو سمجھے بغیر اور اس کی ذہنی الجھنوں سے واقف ہوئے بغیر اسے بھری جماعت میں ''مرغا'' بنا دیتا ہے یہ ''مرغے'' اسکول میں تو رہتے ہیں لیکن کالجوں میں آزادی کی فضا میسر آتے ہی پر پرزے نکالنے شروع کرتے ہیں اور نتیجہ بدتمیزی سے لے کر تشدد تک کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے والد نے جو بیج بویا تھا اور استاد نے جس کی آبیاری کی تھی وہ اب اپنا کانٹوں بھرا پھل لیے آتا ہے یوں عوام، پریس اور والدین سبھی چیخ اٹھتے ہیں---الحذر! الحذر!

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ سبھی برے ہیں والدین بھی اچھے ہوتے ہیں اور اساتذہ بھی قابلِ قدر مل جاتے ہیں لیکن ان میں سے اکثریت کی اچھائی اور خوبیاں شعوری کاوش اور ذمہ داری کے کس احساس کی بنا پر نہیں ہوتیں، وہ فطرتاً اچھے ہوتے ہیں ویسے ایک بات تو طے سمجھیے کہ نژادِ نو کی تعمیر میں آج کے اساتذہ اور والدین مثبت کی بجائے منفی کردار ادا کر رہے ہیں ضرورت اس کی ہے کہ وہ بدلتے حالات اور نفسیاتی علوم سے خود کو روشناس کراتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش کریں۔ کس ڈھنگ کی عورت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سلیقہ نہیں تو کیوں شادی کر کے بچوں کی فوج ظفر موج پیدا کریں، کسی آرام دہ ملازمت کی تلاش ہے تو اسکول ہی کی ملازمت کیوں ہو۔؟

تعلیمی اداروں میں نظم وضبط اور طلبہ میں ڈسپلن کا فقدان اب اتنی عام بات ہو چکی ہے کہ اسے بطور خاص اجاگر کرنے کے لیے مثالوں اور شواہد کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک ہر درجہ کے طلبہ اپنی استعداد اور بساط کے مطابق شرارت بدتمیزی اور تشدد پر مبنی طرزِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ اخبارات میں ایسی خبریں اب روزمرہ کا معمول بن چکی ہیں، ان سے جہاں معاشرے میں جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ بحیثیت مجموعی ہمارے معاشرے میں مریضانہ رجحانات کس حد تک جڑ پکڑ چکے ہیں۔ یہ درست ہے کہ آبادی میں جرائم کے تناسب کے لحاظ سے طلبا بھی اپنا کردار ادا کر رہے ہیں اور شاید دیگر معاشرتی گروہوں کے

مقابلہ میں بظاہر یہ تناسب بہت کم معلوم ہو لیکن یہ کم تناسب اس بنا پر تشویش انگیز صورت اختیار کر لیتا ہے کہ معاشرے کے باقی طبقات سے وابستہ افراد نے تو زندگی میں جو کچھ کرنا یا بننا تھا وہ بن گئے مگر طلبہ تو ابھی کچھ کرنے اور کچھ بننے کے عمل میں سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں تشدد اور جارحیت پر مبنی طرزِ عمل یا مجرمانہ رجحانات کا مظاہرہ انفرادی سطح پر شخصیت کے مریضانہ رجحانات کے ساتھ ساتھ بحیثیت مجموعی طالب علم برادری کے لیے خطرناک علامات بھی قرار دیے جا سکتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ جن طلبا کے منفی کردار کی رودادیں اخبارات کی زینت بنتی ہیں وہ زیادہ تر کالجوں اور یونیورسٹیوں سے متعلق ہوتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کے غیر معمولی طرزِ عمل اور ابنارمل کردار کا مشاہدہ پرائمری جماعتوں سے کیا جا سکتا ہے بالفاظ دیگر اس کا عمر اور تعلیم کے مقابلہ میں طالب علم کی بنیادی نفسیات اور اس سے وابستہ بعض اساسی رجحانات سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے تو چھوٹی جماعتوں میں بھی شریر، بدتمیز، اور مجرمانہ رجحانات کے حامل بچے مل جاتے ہیں۔ طلباء میں غیر معمولی طرزِ عمل، ابنارمل کردار، غیر سماجی رویہ بیشتر صورتوں میں بذاتِ خود کسی مرض نہیں بلکہ پریشان شخصیت کی مریضانہ علامات ہیں ایسی علامات جو ہر بچے میں منفرد رنگ رکھنے کے باوجود کچھ ایسی مشترکہ خصوصیات کی حامل بھی ہوتی ہیں کہ ان سے بچہ کی شخصیت کے مجموعی خدوخال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے ہاں بچوں اور بچپن کے بارے میں یہ ایک بڑا غلط اور گمراہ کن تصور ملتا ہے کہ بچہ تو بادشاہ ہے، عہدِ طفلی زریں دور ہے اور بچپن آزادی اور خوش حالی کا زمانہ ہوتا ہے۔ جہاں تک فکرِ معاش سے آزادی کا تعلق ہے تو یہ درست ہے لیکن بچے کے لیے بچپن جذباتی الجھنوں کا دور بھی ہوتا ہے۔ غربت سے عدم تحفظ کا احساس، والدین کا نامناسب سلوک (جس کی شدت سوتیلے باپ یا ماں کی صورت میں اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے) اپنی بدصورتی کا احساس کمتری، افرادِ کنبہ (بھائی، بہن، رشتہ دار) کا منفی رویہ اور اس نوع کی چھوٹی بڑی لاتعداد وجوہات ہیں جن سے بچہ کم عمری سے ہی اعصابی تناؤ میں مبتلا رہتا ہے یوں اس سے

چھٹکارا پانے کے لیے یا (بیشتر صورتوں میں) خود کو دوسروں کی نظروں میں ممتاز کرنے کے لیے وہ شرارت، بدتمیزی اور اسی طرح کی غیر معمولی حرکات کا سہارا لیتا ہے۔ ادھر گھر والے یا استاد اس کے ان جذباتی مسائل کو سمجھے بغیر ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ سزا سے کسی کو بھی سیدھا نہیں کیا جا سکتا۔ بچہ وقتی خوف کی بنا پر ایسے رجحانات کو شعوری کاوش سے دبا سکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے انھیں شخصیت سے جلا وطن نہیں کیا جا سکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ لاشعور ان کے لیے دیگر مراکز تلاش کر لیتا ہے۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کالج میں پرنسپل کے دفتر پر قبضہ کرنے والا طالب علم لاشعوری طور پر پرنسپل کو باپ کی علامت سمجھ کر اس کے ہاتھوں اپنی ذلت کا، پرنسپل کی تذلیل کی صورت میں، انتقام لے رہا ہو۔ اس طرح اسکول میں مرغا بننے والا بچہ گھر آ کر چھوٹی بہن کی چٹیا کھینچ کر، اس کی گڑیا یا گھر کی چیزیں توڑ کر اس اعصابی تناؤ سے نجات حاصل کر رہا ہو جس میں وہ اسکول میں مبتلا رہا۔ ایسے بچوں کے لیے ڈنڈے کی نہیں بلکہ ماہرِ نفسیات کی ضرورت ہے۔ ہم نے اب تک اس طرف توجہ نہیں دی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج ہماری درسگاہوں کے لیے نفسیاتی مشوروں کے مراکز کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی فرسٹ ایڈ کی۔ ہمارے ہاں ابھی تک اسکولوں میں بالخصوص اور کالجوں میں بالعموم فرنیچر، ٹھنڈے پانی اور پنکھوں جیسی بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے اس لیے تعلیمی درسگاہوں میں غیر معمولی طرزِ عمل کے حامل بچوں اور مجرمانہ رجحانات رکھنے والے طلبا کے لیے نفسیاتی مشوروں کے مراکز قائم کرنے کی بات پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پانی اور پنکھا زیادہ ضروری ہے کہ نفسیاتی مشورہ؟ اور اس سے بھی اہم اعتراض یہ کہ اس کام کے لیے نفسیات دان کہاں سے ملیں گے؟ جہاں تربیت یافتہ اساتذہ کم یاب ہوں وہاں کوالیفائیڈ نفسیاتی معالج کہاں سے آئیں گے؟ اسکولوں کے مقابلہ میں کالجوں میں اس کا حل آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے، بیشتر کالجوں میں نفسیات کا مضمون پڑھایا جاتا ہے اس لیے نفسیات کے اساتذہ یہ کام بطریقِ احسن سر انجام دے سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے طلبہ اور ان کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے

اساتذہ کے تعاون سے نفسیاتی مشوروں کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ کلاسوں میں جن طلبا کا طرزِ عمل درست نہیں یا جو کلاسوں سے باہر دوسروں کے لیے وجہ پریشانی بنے رہتے ہیں انہیں بلا کر بات چیت سے ان کے جذباتی مسائل کی تہہ تک پہنچ کر انھیں درسِ خود شناسی دیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کمرہ اور ٹائم ٹیبل میں ایک یا دو فارغ پیرڈ کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ اسکولوں میں نفسیات کے اساتذہ نہیں ملتے لیکن ایسے ہمدرد اور باشعور اساتذہ کی کمی نہ ہوگی جو طلباء سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنے کے اہل ہیں اور جو ان کے جذبات و احساسات کو سمجھ کر مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لیے طلبہ کے لیے محبت اور شفقت رکھنے والے اساتذہ کی امداد سے اسکولوں میں بھی محدود پیمانے پر نفسیاتی مراکز کا قیام ممکن بھی ہے اور سودمند بھی، حتیٰ کہ پرائمری کی سطح پر بھی چھوٹے بچوں کے لیے اس انداز پر مشورہ مراکز قائم کیے جا سکتے ہیں۔ بچوں کی نفسیاتی شخصیت کی تکمیل میں والدین، افرادِ کنبہ اور گھر کا ماحول جو اساسی کردار ادا کرتا ہے اسے بطورِ خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ غیر معمولی طرزِ عمل کے حامل بچوں کی شخصیت اور ان کے مخصوص اثرات کی تفہیم کے لیے بچے کے گھر کے ماحول اور اس کے والدین کے بارے میں معلومات ضروری ہو جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے بچے کے والدین یا دیگر بزرگوں سے رجوع ضروری بھی ہے اور فائدہ مند بھی، کیونکہ بیشتر صورتوں میں بچے کے والدین اور گھر کے ماحول میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوگی۔ والدین اسکول، کالج میں بھیج کر بچے کے بارے میں خود کو اپنی تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ آج کی تیز رفتار زندگی اور مصروفیات میں بیشتر والدین کے پاس اسکول جا کر بچے کے بارے میں اساتذہ سے تبادلہ خیال کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے بچے کے نفسیاتی مسائل کے سلسلہ میں والدین کا تعاون حاصل کرنا اشد ضروری ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ خود والدین کو ہوگا، جو اپنے بچے کو اولاد سے بڑھ کر ایک فرد کے روپ میں دیکھیں گے تو انھیں یہ احساس بھی ہوگا کہ بچے کی اپنی شخصیت بھی ہے اور اس کے مخصوص نفسیاتی تقاضے بھی ہیں۔ یہ آگہی انھیں خود کو بھی ٹٹولنے پر مجبور کر دے گی اور یوں

بچے کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی کچھ سیکھ سکیں گے۔

نرسری یا نسبتاً چھوٹی عمر کے بچوں کے لیے ''کھلونا گھر'' کی صورت میں ایک نفسیاتی شفا خانہ قائم کیا جا سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بچہ محض کھلونوں سے کھیلتا ہی نہیں بلکہ اپنے جذبات واحساسات کی ان کھلونوں کے ساتھ ہم آہنگی بھی کرتا ہے۔ گویا بچہ کھلونا توڑ کر اپنے اندر کی جھنجھلاہٹ، غصہ، حسد، احساس کمتری، مرکز توجہ بننا وغیرہ کئی طرح کی الجھنوں کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے کھلونوں سے کھیلتے بچوں کے مشاہدہ سے ان کی جذباتی کش مکش کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کے والدین سے گفتگو کے ذریعے بچے کے مسائل سمجھے جا سکتے ہیں۔

طالب علم کو عمر کے ہر حصہ اور تعلیم کے ہر درجہ میں راہنمائی، ہمدردی اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بروقت نہ ملنے کی بنا پر غصہ اور جھنجھلاہٹ میں وہ ناپسندیدہ طرزِ عمل اور غیر سماجی رویہ اپناتا ہے۔ اگر تعلیمی اداروں میں نفسیاتی مشوروں کے ایسے چھوٹے چھوٹے مراکز ہوں تو ان سے بعض اوقات بڑے بڑے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت کی گرانٹ اور محکمہ تعلیم سے اجازت کی ضرورت نہیں، چار ہمدرد استاد مل بیٹھیں تو کام بن سکتا ہے۔

☆☆☆